شافع قدوائی*

۱۸۵۷ء کی تاریخ نویسی اور غالب کا روزنامچہ **دستنبو**: نوآبادیاتی نقالی اور بقا کی سیاست کا مطالعہ

Historiography of 1857 and Ghalib's *Dastanbu*: A Study of Colonial Mimicry and the Politics of Survival

Abstract:

The events of 1857 constitute a turning point in the colonial history of the Subcontinent, representing a major challenge to British imperial rule. This essay examines the competing interpretations of 1857—as a Sepoy Mutiny, a Peasant Revolt, or the First War of Independence—and traces the evolution of these narratives from colonial and nationalist frameworks to contemporary Subaltern perspectives. Attention is given to the responses of two major Urdu intellectuals, Sir Syed Ahmad Khan and Mirza Ghalib. While Sir Syed attempted to mediate between the British and Indian Muslims through political analysis, Ghalib documented the siege and aftermath of Delhi in his Persian diary, *Dastanbu*. Written amid personal financial hardship and political turmoil, the diary reflects Ghalib's politics of survival. The essay argues that *Dastanbu* is marked by profound ambivalence. On the surface, Ghalib condemns the "rebellious sepoys" and lavishly praises British justice and civilization. This stance can be understood through Homi K. Bhabha's concept of Colonial Mimicry, whereby the colonized subject imitates the colonizer to gain recognition and security. Ghalib's dependence on British patronage, including his pension and titles, encouraged such displays of loyalty. Yet a closer reading reveals important silences and subversions. Alongside his praise of British rule, Ghalib records the starvation, killings, and displacement suffered by Delhi's residents after the British victory. By documenting the suffering of ordinary people, *Dastanbu* becomes more than an act of flattery; it emerges as a coded record of civilizational collapse and of an intellectual caught between a fading Mughal order and an unforgiving colonial future.

Keywords: 1857, War of Independence, Mutiny, Sir Sayyad, Ghalib, Dastanbu, Homi K Bhabha, Colonial Mimicry.

برصغیر کی نو آبادیاتی تاریخ میں مزاحمت ایک اجتماعی واردات کے طور پر ۱۸۵۷ء میں ابھری اور مئی سے لے کر ستمبر ۱۸۵۷ء تک جاری رہنے والی اس خون آشام مزاحمت نے برطانوی سامراج کے استحکام پر سوالیہ نشان قائم کر دیا تھا۔ تشخص اور ملکی سر بلندی کی لڑائی شمالی ہند کے ایک بڑے حصے میں لڑی گئی مگر آخرش حکومت برطانیہ ہی فتح یاب ہوئی۔ انگریز افسروں، عالموں اور مئورخوں کے علاوہ ہندوستان کے تاریخ نگاروں، مفکروں، ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس انقلاب آفریں تحریک کو اپنی تحقیقی اور تخلیقی تگ و تاز کا ہدف بنایا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کی بازدید جنوب ایشیائی مطالعات کا ایک اہم موضوع ہے۔ حکومت برطانیہ کے خلاف سب سے مؤثر تحریک کی مختلف تعبیروں اور تشریحات سے قطع نظر، چار ماہ کے عرصے کو محیط واقعات اور حالات کو کسی مرکزی حوالے سے بیان کرنے کا مسئلہ بھی اہل علم کے مابین باعثِ نزاع رہا ہے۔

۱۸۵۷ء کو کس عنوان سے منسوب کیا جائے؟ یہ ایک اہم اور متنازعہ فیہ سوال ہے۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی ہر تحریر اس سوال کی تفصیل اور تاویل سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ کیا یہ ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت تھی یا بنگال رجمنٹ کی حکم عدولی تھی؟ کیا یہ عوام کی ایک قابل لحاظ تعداد کی سرکشی تھی؟ کیا اسے کسانوں کی بغاوت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی تھی یا یہ مزاحمت تہذیبوں کے تصادم کی داستان بیان کرتی ہے؟ ۱۸۵۷ء سے متعلق کتابیں، رسالے اور دیگر تحریریں مذکورہ بالا استفسارات کی تفصیلی تشریح سے عبارت ہیں۔

اردو ادب کی دو سرکردہ شخصیتوں مرزا اسد اللہ خاں غالب (۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء) اور سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کو اپنے تخلیقی ارتکاز کا ہدف بنایا۔ سر سید تو ہندوستان کے پہلے ایسے ادیب اور عوامی دانشور ہیں جنھوں نے اس موضوع پر چار متون تیار کیے۔ وہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے نہ صرف عینی شاہد تھے بلکہ انھوں نے اس میں سرگرم شرکت بھی کی۔ وہ بجنور میں تعینات تھے جب بغاوت کا آغاز ہوا تھا۔ انھوں نے چار کتابیں: رسالہ تاریخ سرکشی بجنور، (۱۸۵۸ء)، مضمون "کیا سبب ہوا سرکشی ہند کا" جواب المعروف بہ اسباب بغاوت ہند (۱۸۵۸ء)[1]، رسالہ خیر خواہان مسلمانان ہند (۱۸۶۰ء) اور ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق برطانوی سول سرونٹ اور امور ہندوستان کے برطانوی سیکرٹری جان ولیم کے (John William Kaye۔ ۱۸۱۴ء-۱۸۷۶ء) کے نام ان کا تفصیلی خط (۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء) ہے۔

مرزا غالب نے دہلی میں بغاوت کے نقطۂ آغاز ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر یکم اگست ۱۸۵۸ء تک دارالسلطنت میں پڑنے والے رن اور نہتے عوام پر مظالم کی خونچکاں روداد اپنے روزنامچے دستنبو میں خاصے جذباتی خروش کے ساتھ، ادق فارسی میں رقم کی ہے۔ اس متن پر حکومت برطانیہ کی غیر مشروط حمایت اور آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کے تئیں گہری نفرت اور بے زاری کے

سائے لرزاں ہیں۔ ۱۵ماہ کو محیط اس روز نامچے کے مرتکز مطالعے سے قبل یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے متعلق بعض اہم کتابوں کا مختصراً ذکر کر دیا جائے اور پھر اس تاریخی اور علمی تناظر میں غالب کے متن کا جائزہ پیش کیا جائے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش، بغاوت یا ناکام جنگِ آزادی پر اوّلین کتابیں، حکومت برطانیہ کے افسروں اور مؤرخوں نے تحریر کی ہیں۔ یہ کتابیں ایک مخصوص نقطۂ نظر کی غماز اور ان میں واقعات کے اندراج اور اسباب و نتائج کے استخراج میں حیرت انگیز طور پر یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تحریریں نو آبادیاتی نقطۂ نظر کی حامل ہیں۔ اس ضمن میں اہم کتابیں:- *A History of the Sepoy War in India. 1857-1858* اور *A History of the Indian Mutiny* ہیں۔

پہلی کتاب کے مصنف جان ولیم کے[۲] ہیں اور اسے W. H. Allen & Co, London نے ۱۸۶۴ء میں شائع کیا۔ دوسری کتاب کے مصنف جارج بروس میلسن (George Bruce Malleson۔ ۱۸۲۵ء-۱۸۹۸ء)[۳] ہیں اور یہ اصلاً تین جلدوں پر مشتمل ولیم کے کی کتاب کی نظر ثانی اور مزید پانچ جلدوں کے اضافے پر مشتمل ہے۔ ۸ جلدوں پر مبنی اس کتاب کو مذکورہ بالا اشاعتی ادارے نے ۱۸۹۱ء میں شائع کیا۔ تیسری کتاب کا پورا نام *A History of the Indian Mutiny: and of the Disturbances Which Accompanied it Among the Civil Population* ہے جو ۱۸۸۳ء میں لندن سے، مندرجہ بالا اشاعتی ادارے ہی سے چھپی۔ اس کتاب کے مصنف تھامس رائس ایڈورڈ ہومس (Thomas Rice Edward Holmes۔ ۱۸۵۵ء-۱۹۳۳ء)[۴] ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک اور اہم کتاب *Lieut.-General Sir James Outram's campaign in India, 1857-1858* ہے جسے Smith & Elder Co. London نے ۱۸۶۰ء میں شائع کیا اور اس کے مصنف لیفٹننٹ جنرل جیمس اوٹرام (Lieut. General Sir James Outram۔ ۱۸۰۳ء-۱۸۶۳ء)[۵] ہیں۔

مذکورہ بالا کتب میں ۱۸۵۷ء کو بنیادی طور پر سپاہیوں کی بغاوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور اس نقطۂ نظر کی سختی سے تردید کی گئی ہے کہ یہ عوامی بغاوت تھی۔ ان مصنفین کے نزدیک یہ فوجیوں کی سرکشی تھی اور اس کے اسباب متعین اور فوری تھے۔ مثلاً چربی آلود کارتوس (Enfield Rifle) کا استعمال، جس سے ہندو اور مسلمان سپاہیوں میں ناراضی پیدا ہوئی۔ ولیم کے، میلسن اور علی الخصوص فوجی جنرل جیمس اوٹرام نے اسے اصلاً مسلمانوں کی سازش سے تعبیر کیا۔ ہومس نے اس پورے عمل کو تہذیب اور بربریت کے مابین تصادم قرار دیا۔ ان کتابوں میں فوجی کارروائی کی مکمل تفصیل اور حکومت برطانیہ کی کاروائیوں کی مستند دستاویز اور شواہد جمع کر دیے گئے ہیں۔ ولیم کے کی کتاب اسنادی شواہد کے لحاظ سے سب سے وقیع ہے۔ یہ تحریریں یورپی نسلی تعصب کی چغلی کھاتی ہیں کہ ان میں ہندوستانی باغیوں کو انتہا پسند، مفسد، ظالم اور احسان فراموش کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ معروضیت اور گہری انسانی ہمدردی کا دعوی کرنے والے ان مصنفین نے ہندوستانیوں کے معاشی، سماجی اور ان کے ہر سطح پر استحصال کے ذکر سے عمداً

اعراض برتا۔ مال گزاری کے قوانین اور دیسی ریاستوں پر برطانیہ کے قبضے نے بغاوت کو ہوا دی تھی۔ مگر ان اسباب کا مطلقاً کوئی ذکر ان کتابوں میں موجود نہیں مگر حکومت کی ہر کاروائی کی تاویل اور جواز جابجا موجود ہے۔

کارل مارکس (Karl Marx۔۱۸۱۸ء-۱۸۸۳) اور فریڈرک اینگلز (Friedrich Engels۔۱۸۲۰ء-۱۸۹۵) نے نیو یارک کے اخبار *Daily Tribune* میں ۱۸۵۷ء کے حوالے سے، نامہ نگار کے طور پر ہندوستانی بغاوت پر سلسلہ وار مضامین لکھے جو بعد میں کتابی صورت میں ماسکو سے شائع ہوئے[۶]۔ ہندوستان میں برطانیہ کی حکومت سے متعلق مارکس نے ابتدا میں متضاد آرا ظاہر کی تھیں۔ مارکس نے لکھا تھا کہ پلاسی کی جنگ کے بعد انگریزوں کو جو دولت حاصل ہوئی تھی، اسی سے انگلستان کے صنعتی انقلاب کی راہ ہموار ہوئی[۷]۔ مارکس نے برطانوی نو آبادیات کو تخریبی قوت قرار دیتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ یہ تاریخ کا لاشعوری عمل ہے۔ اور اس کے توسط سے پیداوار کے ایشیائی ماڈل میں مطلوبہ سماجی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔

تاہم بغاوت کی ناکامی کے بعد شائع ہونے والے اپنے مضامین میں مارکس نے ہندوستانی باغیوں کی مکمل حمایت کی اور لکھا کہ یہ محض فوجی بغاوت نہیں تھی بلکہ یہ اصلاً قومی انقلاب تھا جس کا سبب، مال گزاری اور ٹیکس کا ظالمانہ نفاذ اور ہندوستانی عوام کا بڑے پیمانے پر منظم استحصال تھا۔ مارکس اور اینگلز نے بغاوت کو ناکام کرنے میں انگریز فوجوں کی بربریت اور منافقانہ رویے کی سخت مذمت کی۔ یہ مضامین مارکس کے نو آبادیات مخالف رویے اور نقطۂ نظر کو بخوبی خاطر نشان کرتے ہیں۔

بیسویں صدی میں ۱۸۵۷ کی ہنگامہ خیز، پر تشدد بغاوت کی تعبیر و تشریح کا قومی نقطۂ نظر سے محاسبے کا سلسلہ شروع ہوا۔ غدر یا بغاوت کے لیے ایک نئی اصطلاح ''پہلی جنگ آزادی'' وضع کی گئی۔ اس امر پر شد و مد کے ساتھ اصرار کیا گیا کہ یہ کوئی غیر منظم بغاوت یا سپاہیوں کی سرکشی نہیں تھی بلکہ غیر ملکی حکومت کے مظالم اور استحصال کے خلاف ایک منصوبہ بند عوامی بغاوت تھی۔ یہ بیانیہ بیسویں صدی کی جنگ آزادی کو مہمیز کرنے کے لیے بہت ضروری تھا کہ اس کا مقصد آزادی کے متوالوں کو ماضی کی حب الوطنی اور بہادری کی یاد دلانا تھا۔ اس ضمن میں سب سے اہم کتاب وینائک دامودر ساورکر (Vinyak Damodar Savarkar۔۱۸۸۳ء-۱۹۶۶ء)[۸] کی تصنیف *The Indian War of Independence 1857* جو ۱۹۰۹ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اصلاً مراٹھی میں لکھی گئی تھی اور بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ کیا گیا۔ انگریزی ترجمہ ۱۹۰۹ء میں سیٹھانی کپانی (Sethani Kampani) نے بمبئی سے شائع کیا اور اس پر ساورکر کا نام نہیں بلکہ An Indian لکھا تھا۔ اس کتاب کو حکومتِ برطانیہ نے ضبط بھی کر لیا تھا۔ ساورکر کے مطابق ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، ہندوستانی عوام کی آرزومندیوں کی نقیب تھی۔ یہ کتاب سیاسی اور تاریخی سطح پر ایک نئے بیانیے کی تشکیل کرتی ہے جس کے توسط سے ہندوستانی مزاحمت کو جذبۂ حب الوطنی اور انگریزوں کے خلاف شدید نفرت اور

ہندوستانیوں کے استحصال کی مختلف سطحوں کے تناظر میں اجاگر کیا گیا۔ یہ کتاب مروّجہ نو آبادیاتی بیانیے کی تکذیب کرتی ہے۔ ساور کر نے قومیت کو مرکز نگاہ بنایا ہے اور اس حوالے سے ۱۸۵۷ء کی تعبیر و تشریح کی ہے مگر قومیت کا تصوّر بیسویں صدی میں پروان چڑھا اور اس کا اطلاق ۱۸۵۷ء پر کرنا محل نظر ہے۔ اس وقت ہندوستانی معاشرہ متحد اور مربوط نہیں تھا اور مشہور مورخ آر سی مجمدار[۹] کے مطابق اس وقت ہندوستان ایک متحد ملک کی صورت میں موجود نہیں تھا اور ساور کر نے اس امر پر توجہ نہیں دی کہ جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان اس شورش میں شریک نہیں ہوا اور ان علاقوں میں حکومت برطانیہ کو حمایت حاصل تھی۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی مؤرخوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات اور ان کے اسباب و علل کا تجزیہ، علمی آزادی کے ساتھ شروع کیا۔ انھوں نے برطانوی حکومت کی دستاویزات اور ان کی کارروائیوں کو بنیاد بنایا اور متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اس سلسلے میں دو اہم کتابیں پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد ٹھیک سو سال کے بعد یعنی ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئیں۔ پہلی کتاب سریندر ناتھ سین (۱۸۹۹ء-۱۹۸۹ء)[۱۰] کی ہے جس کا عنوان *Eighteen Fifty Seven* ہے۔ اس سلسلے کی دوسری اہم تصنیف آر سی مجمدار (R.C. Majumdar-۱۸۸۸ء-۱۹۸۰ء) کی *The Sepoy Mutiny and the Revolt of 1857* ہے۔ یہ دونوں کتابیں مستند مواد اور متوازن نقطۂ نظر کے باعث جنوبی ایشیائی مطالعات میں سنگ میل سمجھی جاتی ہیں۔ پروفیسر سین کو حکومت ہند نے ۱۸۵۷ء کی تاریخ مرتب کرنے کی ذمہ داری تفویض کی تھی اور ان کا نقطۂ نظر خاصا معتدل ہے۔ ان کے مطابق ابتدا میں یہ فوجی بغاوت تھی مگر اودھ اور بعض دیگر مقامات پر اس نے عوامی بلکہ قومی بغاوت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ سین کا یہ قول اکثر نقل کیا جاتا ہے: "مذہب کے نام پر جس کا آغاز ہوا، اس کا خاتمہ آزادی کے لیے جنگ پر ہوا (What began as a fight for religion ended as a war of Independence)۔ آر سی مجمدار نے ۱۸۵۷ء سے قبل ہونے والی قبائلی اور کاشت کاروں کی بغاوت کا ذکر کیا اور لکھا کہ اسے پہلی یا قومی جنگ آزادی قرار دینا درست نہیں ہے۔ ان کی دلیل ہے کہ چوں کہ زیادہ تر ہندوستانی اس میں شریک نہیں تھے، اس لیے اسے قومی نہیں کہا جاسکتا اور جنگ آزادی اس لیے نہیں کہ لیڈر اپنے جاگیر دارانہ مفادات کی خاطر لڑ رہے تھے اور ان کے پیشِ نظر قومی مفاد نہیں تھا۔ یہ دونوں متون سیاسی خطابت سے عاری اور دستاویزات کے گہرے مطالعے کی خبر دیتے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ایک حد تک معروضی اور تنقیدی شعور کی حامل ہیں۔ بعض عالموں کے نزدیک یہ دو کتابیں زمینی حقائق سے زیادہ ۱۸۵۷ء کے قائدین (نامطمئن راجوں، شہزادوں، زمین داروں اور سپاہیوں) کے کردار کو موضوع بحث بناتی ہیں۔ عام ہندوستانیوں علی الخصوص کسانوں کے مسائل کو اجاگر کرنے میں تساہل کا احساس ہوتا ہے۔ سین اور مجمدار نے اس تحریک کی قیادت کرنے والوں کے محرکات اور مقاصد کی نشان دہی تو کی مگر یہ دونوں مؤرخ بغاوت کی آبیاری کرنے والی عوامی طاقت کا محاسبہ کرنے سے بڑی حد تک قاصر رہے ہیں۔

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں تاریخی اور سماجی مطالعات کا ایک نیا اسکول منصۂ شہود پر آیا۔ اس نے ۱۸۵۷ء کے اب

تک کے مطالعات (جو نو آبادیاتی، قومی اور مارکسی کہے جاتے ہیں) کو بالائی طبقے کی طرف راجع قرار دے کر، انھیں ردّ کیا۔ بالائی طبقے کی فکر و علمیات کی جگہ حاشیائی طبقے کے نقطۂ نظر کو بنیاد بنایا۔ یہ اسکول Subaltern Studies" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں رنجیت گوہا اور رد رانگشو مکھرجی کی کتاب *Awadh in revolt, 1857-1858: A Study of Popular Resistance* خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ان مؤرخوں کے مقابق حاشیائی طبقہ خود مختارانہ شعور سے متصف ہوتا ہے اور اس کا ردِّ عمل قومی، مارکسی لیڈروں کا تابع نہیں ہوتا۔ اور نہ ان کا عمل نو آبادیاتی دعوے کی توثیق کرتا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر انتہا پسندانہ ہوتا ہے۔ ان کے عمل کی اپنی منطق ہوتی ہے جو افواہ، مذہبی وفاداری، طبقہ کے وقار اور قرابت داری سے نمو پذیر ہوتی ہے۔

رنجیت گوہا اور مکھرجی کی کتاب کے مطالعے سے منکشف ہوتا ہے کہ اس کا انحصار خطوط، رپورٹ، اور مقدمے کی رودادوں پر ہے جو برطانیہ اور ہندوستان کے اعلیٰ افسران کی تحریر کردہ ہیں۔ ان مباحث کا عوام الناس سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔

برطانیہ کے مقبول مؤرخ ولیم ڈیل رمپل (William Dalrymple۔پ:۱۹۶۵ء)[۱۲] نے ہندوستان کی مغلیہ تاریخ پر متعدد، متن تیار کیے۔ ولیم نے بغاوت سے متعلق اردو اور فارسی میں دستیاب مسودات کا استعمال کر کے دہلی غدر کا انسانی بیانیہ خلق کیا جس کا محور بہادر شاہ ظفر ہیں اور بادشاہ کی انفعالیت اور بے بسی کو گہری درد مندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کے مطابق، بغاوت، عیسائی مشنریوں کے مذہبی بیانات، اور باغیوں کے جذبۂ جہاد سے نمو پذیر ہوئی تھی۔ اس تصنیف میں ہندوستانی ماخذات اور برطانوی دستاویزات کا وسیع پیمانے پر استعمال کیا گیا اور نو آبادیاتی مؤرخوں کی غلط بیانیوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ ڈیل رمپل نے اس عہد کے اسلامی انتہا پسندوں کے تناظر میں ۱۸۵۷ء کے تصوّر جہاد کا مطالعہ کیا اور ان کا انداز بڑی حد تک معذرت خواہانہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ڈیل رمپل کی تحریروں کو Apologetic History سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دہلی کے واقعات کا تو تفصیلی محاسبہ کیا گیا ہے مگر اودھ اور کان پور میں کیا ہوا، اس کا بیان بہت سرسری ہے۔

۱۸۵۷ء سے متعلق ان کتابوں کے تناظر میں مرزا غالب کے روزنامچہ دستنبو کا مطالعہ دراصل ایک تخلیقی فن کار کے ردِّ عمل اور اس کے ذاتی مفادات، محرکات اور طالع آزمائی کی مختلف صورتوں کی نشان دہی سے عبارت ہے۔ غدر سے متعلق سر سیّد کی تصانیف اور غالب کے خطوط کے بعض اندراجات اور دستنبو کا تجزیہ اس نہج سے نہیں کیا گیا۔

دستنبو کے اندراجات کو مرتکز مطالعہ کا ہدف بنانے سے قبل غالب کی رودادِ حیات اور روزنامچہ لکھنے کے محرکات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ، سمرقند سے ہندوستان وارد ہوئے تھے۔ غالب کے والد مرزا عبد اللہ بیگ کا

انتقال ۱۸۰۲ میں ہو گیا تھا اور ان کے دوسرے بھائی مرزا نصر اللہ بیگ نے جو مغل دربار سے، وابستہ تھے، بغیر کسی مزاحت کے آگرہ کا قلعہ لارڈ لیک کے سپرد کر دیا تھا۔ لارڈ لیک نے مرزا نصر اللہ بیگ کو ۴۰۰ سواروں کا رسالہ دار ۱۷ سو روپے ماہانہ تنخواہ اور دو مواضعات سونکھ اور سوسا انھیں تفویض کیے تھے [۱۳]۔ نصر اللہ بیگ کے انتقال کے بعد ان کی پنشن میں جو غالب کا حصہ مقرر ہوا تھا، اس سے غالب مطمئن نہیں تھے اور انھوں نے اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کیا اور ۱۶ برس تک مقدمہ چلتا رہا جس کے باعث غالب بہت زیر بار ہو گئے تھے۔ غالب نے اسی سلسلے میں کلکتہ کا سفر بھی کیا مگر انھیں کامیابی نہیں ملی۔

غالب نے ہمت نہیں ہاری اور انھوں نے ۱۸۳۶ء میں گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ کے سامنے عرضداشت پیش کی۔ مگر یہاں سے بھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا اور غالب کے مقدمہ کو انگلستان کی شاہی عدالت (Council King) کو بھیج دیا گیا۔ غالب نے ۱۸۵۵ء میں ملکہ وکٹوریہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور اسے اپنی درخواست کے ساتھ براہ راست لندن روانہ کیا مگر انھیں مطلع کیا گیا کہ وہ اپنی عرضداشت گورنر جنرل کے توسط سے بھیجیں اور ان کی درخواست ۱۸۵۶ء میں انگلستان بھیجی گئی۔ جنوری ۱۸۵۷ء میں انھیں اُمید افزا جواب موصول ہوا۔ غالب کو پنشن میں اضافہ کی پوری امید تھی کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بغاوت ہو گئی اور ان کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ باغی سپاہیوں کے دہلی پہنچنے پر بہادر شاہ ظفر نے ان کی قیادت قبول کر لی جس کے باعث انھیں دہلی کے تخت پر عارضی طور پر مکمل اختیار بھی حاصل ہو گیا تھا۔ اس موقع پر ظفر کی مدح میں غالب نے ایک سکہ بھی پیش کیا تھا جو منشی جیون لال نے اپنی ڈائری میں درج کیا ہے [۱۴]۔ اس سلسلے میں عبد الطیف نے لکھا ہے غالب نے ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو ایک قصیدہ [۱۵] دربار میں پیش کیا اور یہ موقع تھا جب آگرہ قلعے پر ہندوستانیوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ غالب کو دربار سے خلعت سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔

دستنبو کے مشمولات کو موضوع گفتگو بنانے کے عمل میں غالب کی ذہنی کیفیات، ان کی شخصی کمزوریوں، مجبوریوں اور سیاسی و سماجی صورتِ حال کو سمجھنے کے ملکہ کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے؛ گو کہ متن کا تعلق مصنف کی شخصیت اور سماجی حالات سے یک طرفہ اور براہِ راست نہیں ہوتا بلکہ اس کی نوعیت بہت پیچیدہ اور سیال ہوتی ہے۔ غالب نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۷ جولائی ۱۸۵۸ء تک کے واقعات لکھے ہیں۔ واقعات کا ذکر تو ضمناً ہے، سارا زور اپنے ردِّ عمل کے اظہار پر ہے۔ روزنامچہ محض واقعات کا معروضی بیان یا کھتونی نہیں ہے۔ غالب نے اپنی کاوشوں کے اصل مقصد کی نشان دہی دستنبو کے آخری صفحات میں کی اور لکھا ہے:

> مئی سال گذشتہ سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے۔ یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش میری ان تین خواہشوں یعنی خطاب، خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انھیں کی طرف لگا ہوا ہے۔ وہ شہنشاہ کہ چاند جس کے سر کا تاج ہے، آسمان جس کا تخت ہے، جمشید نشان، فریدوں فر، کاؤس

مرتبہ، سنجر شکوہ، سکندر حشم، وہ شہنشاہ کہ شاہ روم اس بات کے لیے شکر گزار ہے کہ اس کے تخت و تاج کی عزت رہ گئی۔[۱۶]

غالب کی دو خواہشیں: خطاب اور خلعت، مغلیہ دربار سے پوری ہو چکی تھیں۔ البتہ پنشن کے لیے وہ حکومت برطانیہ کے دست نگر تھے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے باہمی اختلاف اور متضاد رویوں کو دستنبو کے دیباچے میں تمثیلی پیرائے میں بیان کیا ہے اور حاکم اور محکوم میں تفریق کے باوجود باہم متحد رہنے کی تلقین کی ہے۔ یعنی ہندوستانیوں کو تلقین کی گئی ہے کہ یہ ایک امر الوہی ہے۔ دیباچے کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

(خدا نے) ان ضابطوں کو اس طرح مرتب نہیں کیا کہ یہ اجرام جو باہم متضاد ہیں [اجرام اطلاق نوع انسانی پر بھی کیا جاسکتا ہے] ایک دوسرے سے دور دور رہتے ہیں اور (کبھی) ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ طاقت کے باوجود فرمان برداری نہ کریں اور قوت کار فرمائی اور صلاحیت تاثیر کے باوصف فرمانِ (قدرت) کے تابع نہ ہوں... ستارے ایک عادل شہنشاہ کے ملازم ہیں (اس) عدالت کے سپاہی کبھی حلقہ انصاف سے قدم باہر نہیں نکالتے ہیں، مل جل کر کام کرنے اور کارسازی (تعمیل حکم) کے علاوہ ان کو کسی چیز سے تعلق نہیں۔[۱۷]

گو کہ بظاہر دیباچے کا تعلق خدا کی ثنا سے ہے مگر اس کی عبارت خاصی رمزیہ (Suggestive) ہے۔ اسی طرح غالب نے تمہید میں ۱۸۵۷ء کی شورش، بدامنی اور فوجی بغاوت کا ایران پر عرب کے حملے سے موازانہ کرتے ہوئے لکھا:

ایران پر عرب کا حملہ (بالکل دوسری چیز تھی، وہ) تو ایک ملک پر دوسرے ملک کے لوگوں کی فوج کشی تھی۔ لیکن یہاں تو فوج نے اپنے سرداروں سے بغاوت کی ہے۔ ایران پر عرب کا حملہ مذہبی بنیاد پر تھا۔ ایران جو علم و حکمت کے لحاظ سے ویران ہو چکا تھا، ایک نئے مذہب کی برکتوں سے معمور ہو گیا اور اس کی بدولت آگ کی پرستش اور غلامی سے نجات پائی، لیکن ہندوستان میں جہاں سوال صرف قانون کا ہے، ہندوستان والے کس نئے آئین کا سہارا لے کر اپنے اس فعل پر خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اہل ایران نے آتش پرستی سے منھ موڑ کر خدا پرستی کا راستہ دیکھا لیکن ہندوستان والے منصف حاکموں (انگریزوں) کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر درندہ صفت انسانوں کے دامن میں گرفتار ہو گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے علاوہ کسی دوسری حکومت میں انصاف کی امید رکھنا بالکل نادانی ہے۔ عربوں کے تازیانے سے جو زخم لگے تھے وہ مبارک مذہب اسلام ان زخموں کا مرہم بن گیا تھا۔ اگر ان مصیبتوں کے بعد زمانہ امن اور راحت کی دولت بخشتا تو مصیبت زدہ غم و آلام کو بھول سکتے تھے۔ اگر کسی واقف راز و صاحب نظر کے خیال میں اس قیامت کے بعد کوئی راحت ملنے والی ہو تو

بتائے اور میرے غم گیں اور خوفزدہ دل کو تسکین بخش کر ممنون کرے (امن وانتظام کے ذمہ دار) ملازمین کاموں سے بغاوت کریں، سپاہی افسروں کو قتل کریں اور خوشیاں منائیں اور ان کو ذرا بھی پشیمانی نہ ہو۔[۱۸]

غالب نے شروع میں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انھوں نے انگریزی حکومت کے نان ونمک سے پرورش پائی ہے اور بچپن ہی سے ان فاتحین عالم کے دستر خواں کے ریزہ چیں ہیں۔ تمہید اور دیباچے پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ روزنامچہ بڑی حد تک غالب کی تخلیقی طباعی کو آشکارا کرنے کے بجائے نو آبادیاتی نظام کے طبقہ اشراف کی حسیت، آرزومندیوں، اقتدار سے قربت حاصل کرنے اور اس سے مسلسل فیض یاب ہونے کی دیرینہ خواہش کا رویا (Vision) خلق کرتا ہے۔ علاوہ بریں یہ متن نو آبادیاتی تسلط کے خلاف پر تشدد مزاحمت کے دوران زندہ رہنے یا بقا اور تحفظ کی سیاست (Politics of Survival) کی پیچیدہ جہتوں کو بھی سامنے لاتا ہے۔

دستنبو کے تمام اندراجات میں ایک پہلو مشترک ہے وہ یہ کہ غالب نے سپاہیوں کی مذمت میں سخت و تند الفاظ تواتر کے ساتھ استعمال کیے ہیں اور انگریزوں کی توصیف وستائش میں حد درجہ مبالغے سے کام لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اس سال جس کا مادۂ تاریخی بہ رعایت تخرجہ "رستنخیز بے جا" ہے۔ اگر صاف صاف پوچھو تو ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا۔ میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس دن جو بہت منحوس تھا، میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے۔ نہایت ظالم و مفسد، اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے۔ شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جو ان فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ پہلے ہی سے ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہو گئی ہو شہر کی حفاظت کی ذمہ داری اور حق نمک ہر چیز کو بھول گئے۔ ان بن بلائے یا مدعو کردہ مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔[۱۹]

اس حوالے سے مزید مثالوں کے لیے اس مقالے کے حواشی ملاحظہ کیجیے[۲۰]۔

حکیم احسن اللہ خاں کے بارے میں یہ مشہور کر دیا کہ وہ انگریزوں کے خیر خواہ اور طرف دار ہیں۔ اس افواہ کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کے گھر پر باغیوں نے حملہ کر دیا۔ حکیم احسن اللہ خاں کا ایک ملازم باغیوں سے مل گیا تھا، اس پر غالب کا ردِّ عمل ملاحظہ کریں۔

برے سے برا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آسکتا۔ بشرطیکہ وہ ولد الحیض نہ ہو۔ یہ خبیث، نمک حرام

> جس کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں، بے حیائی کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دہانہ فراخ ہو گیا ہے، اپنے آپ کو زہرہ و مشتری کی طرح سمجھتا ہے۔ ہر طرف کولھے مٹکاتا ہوا، انداز دکھاتا ہوا گزرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تدرو کو شرماتا ہے۔ میں نے اس کا نام نہیں لکھا کہ وہ گدازادۂ گم نام ہے۔[۲۱]

دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضہ پر غالب کا تاثر دیکھیے۔

> شہر میں بد باطن (باغیوں) کی جو فوج تھی۔ اس میں سے کچھ لوگوں نے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ اور کچھ لوگوں نے غرور میں آکر لڑنے کی تیاری کی خبیث اور آوارہ لوگوں کا یہ گروہ شیر دل فاتحین سے الجھ پڑا۔[۲۲]

> گمراہ باغی اندرون و بیرون شہر سے خنزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ کشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی آفت اس گلی تک آگئی۔ خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے۔[۲۳]

غالب نے سپاہیوں اور انگریز مخالف عوام کو طنز و تعریض اور دشنام طرازی کا ہدف بنایا مگر انگریزوں میں ان کو کوئی خامی دکھائی نہیں دی اور وہ انھیں انصاف پسند، تعصّب سے عاری اور انسان دوست نظر آتے رہے۔ روزنامچہ کے صفحات ان کی تعریف و توصیف سے پر ہیں۔ اس سلسلے کی چند مثالیں دیکھیے:

> سچ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے علاوہ کسی دوسری حکومت میں انصاف کی امید رکھنا بالکل نادانی ہے۔[۲۴]

> اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گل اندا موں (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ، ویرانی اور بربادی کے سبب، بیماروں کا مدفن بن گیا۔[۲۵]

> افسوس وہ پیکر علم و حکمت، انصاف سکھانے والے، خوش اخلاق و نیک نام حاکم اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچی چاندنی کی طرح دمکتے تھے۔ حیف وہ بچے جنھوں نے ابھی دنیا کو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا، جس کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی، یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحر فنا میں) ڈوب گئے۔[۲۶]

اس حوالے سے مزید مثالوں کے لیے اس مقالے کے حواشی ملاحظہ کیجیے[۲۷]۔

باغیوں کی شدید مذمت اور انگریزوں کی غیر مشروط مدح سرائی کو خوشامد، تملق اور مقصد بر آری کی بہر صورت کوشش قرار دینا ایک نوع کی سادہ لوحی ہے۔ یہ رویہ دراصل ایک دفاعی حکمت عملی اور زندگی کے جدید تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے اور سرخرو ہونے کی انسانی تمنا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے دراصل ایک غلام ملک میں حاکم اور محکوم کے مابین تضاد بھی ظاہر ہوتا ہے جو نو آبادیاتی ڈسکورس میں مضمر عدم استحکام اور دہرے پن کو اجاگر کرتا ہے۔ مشہور پس نو آبادیاتی اور ثقافتی ناقد اور ادبی نظریہ ساز ہومی کے۔ بھابھا(Homi K. Bhabha۔پ:۱۹۴۹ء)[۲۸] نے اس پورے عمل کی وضاحت کے لیے ایک بلیغ اصطلاح نو آبادیاتی نقل (Colonial Mimicry)استعمال کی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نو آبادیاتی ملک میں محکوم میں ہر سطح پر حاکم کی تقلید کی شدید خواہش بیدار ہو جاتی ہے اور وہ اپنے تصوّر کائنات اور تصوّر تہذیب سے دست کش ہو کر واضح طور پر مہذب بننا اور اپنی اصلاح چاہتا ہے۔ ہر چند کہ وہ بالکل اپنے آقا کی طرح بننا چاہتا ہے مگر ایسا ہو نہیں پاتا ہے۔ ہومی بھابھا نے نو آبادیاتی نقل کے تصوّر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ایک ایسی اصلاح شدہ اور قابلِ شناخت "غیر"(Other) کی خواہش، جو ایک ایسی ذات (subject) کے طور پر سامنے آئے جس کا فرق (سفید حاکم سے مقامی باشندے کا فرق) تقریباً مٹ چکا ہو، مگر مکمل طور پر نہیں (یعنی وہ بالکل ویسا ہو، مگر ویسا نہ ہو)۔[۲۹]

نو آبادیاتی حکمرانوں کی سیاسی حکمت عملی کا اصل مقصد محکوموں کو اپنی ثقافت، رویوں، اداروں اور حتیٰ کہ زبان (میکالے کا مجوزہ نظام تعلیم اس کی سب سے بہتر مثال ہے) سے نفرت کرنا سکھانا ہوتا ہے اور حکمرانوں کی ثقافت کو فخر کے ساتھ اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ حکمرانوں کو ہمیشہ اس قسم کے "مہذب محکوموں" کی ضرورت ہوتی ہے جن کے توسط سے نظام حکومت بخوبی چلایا جا سکے۔ بھابھا نے یہ بھی لکھا کہ نقل کبھی مکمل نہیں ہوتی اور اگر محکوم حاکم کی عین نقل بن جائیں گے تو پھر وہ تہذیبی اور نسلی تفریق بھی مٹ جائے گی جس پر نو آبادیات کا انحصار ہے۔ نو آبادیاتی ملک میں نقل کو اصل بننے سے روکنے کا عمل بہت پر پیچ اور گھمبیر ہوتا ہے کہ حکمران بظاہر اپنی تقلید کی تاکید کرتے ہیں مگر فی الاصل اس عمل میں رخنہ اندازی کرتے ہیں تاکہ نو آبادیاتی اجارہ داری قائم رہے۔ اسے بھابھا نے دوجذبیت یعنی Ambivalence کہا ہے۔ محکوم باشندہ، حاکم کی نقل کے ضمن میں گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔

غالب نے سپاہیوں کو بدذات اور مفسد اور بغاوت کو غیر پسندیدہ اور غیر ضروری قرار دیا ہے اور انگریزوں کو بہادر، رحم دل اور عقل مند ٹھہرایا ہے۔ غالب نے حکمرانوں کے بیانیے (امن اور قانون کی بالادستی بہ مقابلہ افراتفری) کی توثیق اور حمایت کر کے اپنی وفاداری اور بغاوت اور تشدد سے خود کو بالکل الگ رکھنے کا اعادہ کیا ہے۔ اس تحریری شہادت کا اصل مقصد خود کو محفوظ رکھنا اور حکمرانوں کو بہر صورت قابلِ اتباع قرار دینا اور ان کے ہر فعل کو جائز ٹھہرانا دراصل بھابھا کے تصوّر Almost the same but

not quite کی اصل تفسیر ہے۔

محکوم طبقۂ اشراف کے نمائندے کے طور پر غالب نے بغاوت کی شدید مخالفت اس بنا پر کی کہ ادنیٰ طبقہ کے افراد نے اس کا آغاز کیا اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بغاوت نے عارضی طور پر سماجی رتبہ کی اس ترتیب کو بھی پوری طرح بدل دیا تھا جس میں طبقہ اشراف کو بالادستی حاصل تھی۔ غالب کے نزدیک حکومت برطانیہ کی کامیابی دراصل اسی سماجی نظام کی زائیدہ تھی جس میں انھیں اور ان کے طبقے کو ہر قسم کی مراعات حاصل تھیں اور سماجی رتبہ بلند تھا۔

ہومی کے بھابھا، گائتری سپواک(Gayatri Chakravorty Spivak۔پ:۱۹۴۲ء)، اور رنجیت گوہا(Ranjit Guha۔ ۱۹۲۳ء-۲۰۲۳ء) نے متن میں موجود خاموشیوں، ابہام، بین السطور اور ان کہے(Unsaid) پہلوؤں کو مطالعہ کا خاص ہدف بنایا ہے۔ پس نوآبادیاتی مطالعے میں مسخ شدہ تشخص اور دہرے شعور کے مظہر رویوں (جن کا اظہار خاموشی، غیاب اور بین السطور اور ان کہے مشمولات سے ہوتا ہے) کو بالواسطہ مزاحمت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ دستنبو بظاہر تو حکومت برطانیہ کی غیر مشروط حمایت اور انگریزوں کی بے محابا تعریف سے عبارت ہے مگر اس کا متن بھی خاموشیوں، غیاب، وقفوں اور بین السطور سے صورت پکڑتا ہے اور دستنبو کے اندر ا جات مرموز پیغامات(Coded Messages) کے طور پر بھی ابھرتے ہیں۔ غالب نے جابجا انگریز حکمرانوں کی انصاف پروری، بے تعصبی اور گہری انسانی دردمندی کا ذکر کیا مگر جب دہلی فتح ہوئی اور انگریز شہر میں داخل ہوئے تو ان کا عمل بربریت اور سفاکی سے پر تھا۔ غالب نے دلی کی بربادی، شہریوں کے قتال اور عام آدمیوں کے مصائب کا ذکر بھی کیا ہے۔

> ...غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کا جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔[۳۰]

آخری جملے کا اطلاق باغی سپاہیوں پر بھی کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بھی لڑ کر شہروں سے غاصب انگریزوں کو بے دخل کیا اور تشدد کا بازار گرم کیا تھا۔ اس پر غالب نے شدید نکتہ چینی کی تھی مگر اس جملے سے غالب نے اپنے نقطۂ نظر کو مسترد کیا ہے۔ اس نوع کا خلط ملط (subversion) دستنبو میں متعدد مقامات پر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر:

> اس غصے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے منھ فق ہو گئے۔ بے شمار مرد عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحب حیثیت بھی۔ ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے، ان میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت پر شہر میں آجائیں گے یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔[۳۱]

اس حوالے سے مزید مثالوں کے لیے اس مقالے کے حواشی ملاحظہ کیجیے [۳۲]۔

انگریزوں کے حسنِ انتظام اور انسانی دردمندی کا کلمہ پڑھتے غالب کی زبان نہیں تھکتی تھی مگر فتح دہلی کے بعد کئی دنوں تک دہلی پر کیا گزری اور عوام کو کس قدر پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، غالب اس کا ذکر کرتے ہیں گو کہ انگریزوں کو مورد الزام نہیں ٹھہراتے مگر روزنامچے کے اندراجات سے انگریزوں کی حسن کارکردگی کا تصوّر پاش پاش ہو جاتا ہے۔

بے گناہ شہریوں کے ساتھ ہر قسم کا ظلم اور ستم روا رکھا گیا اور دہلی جو ایک تہذیبی شہر تھا، مکمل طور پر ویران کر دیا گیا تھا۔ غالب اس پر نوحہ کناں ہیں اور انگریزوں کے طرزِ عمل کے غیر انسانی پہلوؤں کو نشان زد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شہر کے بیشتر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے۔ کچھ لوگ بہ دستور امید و بیم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں۔ جو لوگ (شہر سے نکل کر) ویرانوں اور گوشوں میں مقیم ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی کوئی حکم (صادر) نہیں ہوا جو لوگ (شہر سے) باہر نکل گئے ہیں۔ یا جو شہر کے اندر مبتلائے پریشانی ہیں۔ ان کے درد کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ کاش شہر کے اندر رہنے والے اور (شہر کے) باہر بسنے والے ایک دوسرے کی زندگی و موت سے واقف ہوتے کہ بے تابی و پریشانی نہ ہوتی۔ بس یہ جاننا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے پریشان ہے۔ شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان حال۔ سب کے دل درد سے بھرے ہوتے ہیں اور سب قتلِ عام کے خوف سے ہراساں ہیں۔ [۳۳]

برطانیہ کی عمل داری میں عوام کی ہراسانی کا ذکر بھی روزنامچے کے صفحات پر ملتا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں واضح طور پر امتیاز برتنے کی کوششوں کو بھی موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔

> آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ تو کوئی آتا ہے کہ کوئی بات سننے کو ملے۔ نہ خود باہر جا (سکتے) ہیں کہ اپنی آنکھوں سے سارے واقعات دیکھیں۔ یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں بے نور۔ اس کش مکش کے علاوہ نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی۔ [۳۴]

خود کو قیدی سمجھنا محض عارضی صورت حال نہیں ہے بلکہ بین السطور سے عیاں ہوتا ہے کہ غیر ملکی تسلط محکومی کی زندگی گزارنے کا مستقل باب ہے۔ تہذیبی اور اخلاقی اقدار کا زوال جو بغاوت کے سرد ہو جانے کے بعد مکمل ہو جاتا ہے لوگوں کو ایک دوسرے سے اجنبی بنا دیتا ہے اور غالب نے اس کا ذکر متعدد بار کیا ہے۔

مسلمانوں پر کس طرح عرصہ حیات تنگ کیا گیا تھا اور ہندوؤں کو کس قدر مراعات دی گئی تھیں۔ غالب اس سے ناواقف نہیں۔ اپنے بھائی مرزا یوسف کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ۱۹ اکتوبر کو پیر کے دن نے جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیے، آتش فشاں اژدھے کی طرح دنیا کو نگل لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کمبخت دربان بھائی کے مرنے کی خبر لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہ فنا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پانی، رومال، غسال، گورکن، اینٹ چونے، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور (میت کو) کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔ بازار میں اچھا برا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں۔ چہ جائے کہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔[۳۵]

> جنوری ۱۸۵۸ء کے آغاز میں ہندوؤں کو فرمان آزادی مل گیا۔ اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ لوگ (ہندو) جہاں جہاں تھے۔ شہر کی طرف چل پڑے۔ خانماں برباد مسلمانوں کے گھروں میں (خالی پڑے رہنے کے سبب سے) سبزہ اس قدر اگ آیا ہے کہ در و دیوار سبز ہیں۔ ہر لحہ سبزہ سر دیوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ (بہ دستور) خالی ہے۔[۳۶]

بغاوت کو برا بھلا کہہ لینے کے بعد انگریزوں کے مظالم کے بیان سے غالب پہلو تہی نہیں کر سکے۔ غالب کو شاہجہاں آباد بہت عزیز تھا اور یہاں کے عوام کی بڑے پیمانے پر ہلاکت نے انھیں بے حد مضطرب کر دیا اور پھانسیوں کی کثرت نے غالب کو تہذیبی مغائرت اور روحانی بحران کی شدید کیفیت سے دوچار کر دیا۔ غالب کو احساس ہوا کہ قید خانہ تو شہر سے باہر ہے مگر حوالات شہر کے اندر ہے اور اس میں ہر شخص اسیر ہے۔ دہلی میں تو بے شمار لوگوں کی پھانسی کے دلدوز واقعات کے بیان سے غالب نے خود کو طنز و تعریض کا ہدف بنایا۔ انھوں نے پنشن دار کو خیرات خور لکھا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب غالب کی ساری تگ و دو پنشن میں اضافہ تک محدود تھی۔

> اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرون شہر۔ ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے (ان محدود مقامات میں کثرت تعداد کو دیکھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمایا جا رہا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے، ان کی تعداد فرشتہ موت ہی جانتا ہے۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں، گویا وہ اس سرزمین (دہلی) کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی

> مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دو دو، چار چار کوس پر ٹیلوں، گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں۔ اس ویرانہ نشین گروہ میں یا تو وہ لوگ ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہش مند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے رشتہ دار ہیں یا خیرات خوار یعنی پنشن دار ہیں۔ لوگوں کی درخواستوں میں رہائی، آبادی یا اجرائے پنشن کے علاوہ اور کوئی (مضمون) نہیں پاؤ گے۔ داد خواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ گئی ہیں۔ یہ انصاف طلب چشم براہ اور گوش بر آواز ہیں کہ کیا سننے اور دیکھنے میں آتا ہے۔[۳۷]

دستنبو کے اندراجات سے غالب کی شخصیت کے دو نیم ہو جانے کا خوب اندازہ ہوتا ہے اور وہ یکساں واقعہ یا صورتِ حال کے تئیں متضاد رویوں کا اظہار کرتے ہیں۔ بغاوت کے دوران میں ایسا لگتا ہے کہ غالب اپنی شہرہ آفاق بذلہ سنجی، اور حسِ ظرافت سے بھی محروم ہو چکے تھے اور وہ اپنے غموں کا مداوا فکر سخن میں تلاش نہیں کرتے تھے۔ اس سے غالب کے تشخص سے عاری ہونے یا ان کے ایک اجنبی تہذیبی وجود میں منقلب ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نو آبادیاتی مطالعہ قومی تاریخ کے سہل الحصول تصوّر پر بھی سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔ دستنبو اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہاں صرف ہندوستانی مجاہدین آزادی اور برطانوی آمریت کو ایک دوسرے کے مقابل کے طور پر پیش کر کے بیانیہ اس ثنویت (Binary) کے گرد خلق نہیں کیا گیا ہے۔ دستنبو وجودی بحران سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اخلاقی سطح پر مفاہمتوں کا دلدوز بیانیہ ہے۔ دستنبو بغاوت کے ایک نئے تناظر کا باب وا کرتی ہے کہ یہ پوری روداد ایک مضطرب اور ہراساں شخص کے نقطۂ نظر سے بیان کی گئی ہے جس کے لیے بغاوت، بدامنی، افراتفری، اور ہلاکت کا سامان لے کر آئی اور انگریزوں کی فتح دہشت اور جبر کا پیام برثابت ہوئی۔

غالب کا مذکورہ متن نو آبادیاتی تسلط کی ایک نمایاں صفت یعنی تصادم اور تعاون کے مسلسل عمل کے پہلودار اور مرتعش بیان کو محیط ہے جس کے مطالعے سے قاری کو لمحۂ بحران میں کیے جانے والی اخلاقی مفاہمت کے مضمرات اور پیچیدگیوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ دستنبو کے مطالعے سے جارج آرویل (George Orwell۔۱۹۰۳ء-۱۹۵۰ء) کے مشہور ناول *Nineteen Eighty-Four* کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ دستنبو کے راوی (غالب) اور آرویل کے مرکزی کردار ونسٹن اسمتھ (Winston Smith) میں مماثلت کے متعدد پہلو سامنے آتے ہیں۔ خارجی حالات کا جبر جب انسان کا عرصۂ حیات تنگ کر دے اور محض زندہ رہنا ہی لازمی قدر بن جائے تو پھر انسان کی نفسیات بھی بدل جاتی ہے اور اسے ظلم و جبر کا بازار گرم رکھنے والا اپنا محافظ نظر آنے لگتا ہے اور اس رویے کو اسٹاک ہوم سینڈروم (Stockholm Syndrome) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہو، ایسی صورت میں دل آسائی اور ہمدردی کی ایک ادنیٰ کوشش کو وہ ظالم کی حقیقی ہمدردی پر محمول کرتا ہے۔ انسان کے پاس

کوئی راہ مفر نہیں ہوتی اور اس کے پاس تحفظ کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ ۱۹۷۳ء میں سویڈن میں بینک ڈکیتی کا واقعہ پیش آیا تھا اور بینک کے ملازمین کو چار دنوں تک یرغمال بنائے رکھا گیا تھا اور جب ملازم رہا ہوئے تو انھوں نے اغوا کاروں کے تئیں مثبت ردِ عمل کا اظہار کیا اور ان کے خلاف گواہی دینے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد سویڈن کے مشہور ماہر نفسیات نیلس بیجروٹ (Nils Bejerot ۱۹۲۱ء-۱۹۸۸ء) نے یہ اصطلاح وضع کی۔

غالب بھی بغاوت کے دنوں میں گھر میں مقید رہے اور اکتوبر کو جب انگریزوں نے غالب کے مکان پر چھاپہ مارا اور انھیں اپنے افسر کرنل براؤن کے پاس لے گئے جنھوں نے نرمی سے بات کی؛ اس پر غالب کا ردِ عمل دیکھیے:

> دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم الحروف کے گھر میں (گھس آئے۔) ان گوروں نے بھل منسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کو ان دونوں بچوں، دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند، دانشور کرنل براؤن کے پاس لے گئے۔ جو چوک سے اسی طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے۔ کرنل براؤن نے مجھ سے بہت نرمی و انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا، خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس خوش اخلاق (کرنل براؤن) کی تعریف کی اور چلا آیا۔[۳۸]

چند منٹوں کی ملاقات میں کرنل براؤن کو دانش ور اور حقیقت پسند قرار دینا، غالب کی سائیکی پر Stockholm Syndrome کے سایہ فگن ہونے کی چغلی کھاتا ہے۔ آرویل کا ہیرو ونسٹن آمریت کی نقیب پارٹی (جس کے لیے بگ برادر کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے) کے ایک کارپرداز اوبرائن (O' Brien)، جو وزارت صداقت (Ministry of Love) کا عہدیدار ہے، کے زیر حراست ہے۔ اور وہ اس پر ہر طرح کا ظلم کرتا ہے۔ موت کا خوف انسان کی انا کو بالکل ختم کر دیتا ہے اور عزت نفس، اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہے۔

اسمتھ دھیرے دھیرے اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور اوبیرن بھی خود کو ایک مشفق اور مربی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو رفتہ رفتہ بیرن اسمتھ اس کے ساتھ دانشورانہ اور جذباتی سطح پر یگانگت کا بھرم قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اوبرائن کوشش کرتا ہے کہ لوگ پارٹی کی صرف اطاعت نہیں کریں بلکہ اس سے حقیقی طور پر محبت بھی کرنے لگیں۔ وہ یہ بھی باور کراتا ہے کہ سچائی اور دانش کے حصول کی راہ میں اذیت ضرور اٹھانا پڑتی ہے۔ ونسٹن اس کی باتوں پر یقین کرتا ہے اور دھیرے دھیرے وہ اپنے تہذیبی تشخص سے عاری ہوتا جاتا ہے۔ ونسٹن کی زندگی کا رخ کمرۂ عقوبت روم نمبر ۱۰۱ میں یکسر تبدیل ہو جاتا ہے جب اسے

زندگی کے سب سے بڑے خوف یعنی چوہوں کا سامنے کرنا پڑتا ہے۔ ونسٹن اپنی محبوبہ جولیا پر جان قربان کرنے کا اعادہ کرتا رہتا تھا مگر جب اس پر چوہے چھوڑے جاتے ہیں تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے "Do it to Julia, Do it to Julia, Not me. Julia"۔

یہی وہ لمحہ ہے جب ونسٹن بنیادی انسانی اقدار محبت اور وفاداری سے محروم ہو جاتا ہے کہ اسے زندہ رہنے کے لیے ان سے دست کش ہونا ضروری تھا۔ دستنبو میں بھی غالب جو دہلی کے پرستار اور بادشاہ، نوابوں اور جاگیرداروں سے اپنی وابستگی کا دعویٰ کرتے تھے۔ مغل دربار سے تو وہ باقاعدہ وابستہ بھی رہے تھے اور انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے لیے سکہ بھی لکھا تھا۔ انگریزوں کی فتح کے بعد، ان کے مکمل طور پر ہم نوا نظر آتے ہیں۔ انگریزوں کی تعریف کرنا ایک بات ہے اور ان کے ہر فعل پر آمنا و صدقنا کہنا دوسری بات ہے۔

ہندوستانیوں کی عیب جوئی کرنا اور باغیوں کو مغلظات سے نوازنا، ایک حد تک "سٹاک ہوم سنڈروم" میں گرفتار ہونے کی ایک صورت ہے اور غالب کا طرز عمل ونسٹن سمتھ کے مماثل نظر آتا ہے۔

غالب کی ڈائری تخلیقی فطانت کے کسی نادیدہ پہلو کی نشان دہی تو شاذ ہی کرتی ہے، اس کے برخلاف یہ روزنامچہ ایک بڑے ذہن کی ہزیمت خوردہ ذہنیت کو خاطر نشان کرتا ہے۔ حالاں کہ غالب نے اپنے خطوط میں بغاوت کا جو ذکر کیا ہے وہ دستنبو سے میل نہیں کھاتا۔ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ دستنبو، سماجی ظاہر داری (Public Posturing) کی ایک شکل ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ:۱۹۶۶ء) پروفیسر شعبۂ اُردو، ڈائریکٹر، سرسید اکادمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ shafeykidwai@gmail.com

۱۔ حالی نے حیات جاوید میں ۱۸۵۷ سے متعلق سرسید کی کتاب کے سلسلے میں لکھا کہ یہ رسالہ صرف ایک دفعہ سرسیّد نے ۱۸۵۸ء میں چھپوایا تھا اور چند نسخوں کے سوا اس کی تمام جلدیں انگلستان میں پارلیمنٹ کے ممبروں کے پاس بھیج دی تھیں اس لیے ہندوستان میں اس کی اشاعت نہیں ہوئی۔ چوں کہ اس رسالہ کا لکھنا جیسا کہ سرسیّد کی لائف میں مفصل بیان کیا گیا ہے ان کی سرکاری، ملکی اور قومی خدمات میں سے ایک عمدہ ترین خدمت تھی۔ اس نظر سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ تمام و کمال سرسیّد کی لائف کے آخر میں بطور ضمیمہ چھاپ دیا جائے تاکہ مرحوم کی اس خدمت جلیلہ کا لوگ پورا پورا اندازہ لگا سکیں۔
الطاف حسین حالی، حیات جاوید، طبع اول، ضمیمہ نمبر ۴ (کان پور: محمد رحمت اللہ رعد نامی پریس، ۱۹۰۱ء)، ۱۵۔
سرسید نے اس رسالہ کا عنوان "مضمون کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا جواب" رکھا تھا اور یہ کتاب اسی عنوان کے ساتھ ۱۸۵۸ء میں علی گڑھ سے اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ حالی نے یہ رسالہ اپنی کتاب میں بطور ضمیمہ شامل کر کے ایک اہم ادبی فریضہ انجام دیا مگر کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ سرسیّد کے عنوان کا ذکر کر کے اپنی ترمیم کی صراحت بھی کر دیتے۔

۲۔ محاربات کے مشہور انگریز مؤرخ ہیں۔ جان ولیم کے ۱۸۵۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سول سروس میں داخل ہوئے تھے اور ۱۸۵۸ء میں انھیں حکومت برطانیہ کے سیاسی اور خفیہ محکمہ اور ۱۸۶۴ء میں حکومت ہند کے سیکرٹری کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔ سرسید نے انھیں ۱۸۵۷ء کے ایک عینی شاہد کے طور پر خط لکھا تھا۔

۳۔ برطانوی افسر اور ادیب اور بغاوت کے عین عروج کے دور میں ان کی کتاب *Red Pamphlet* کلکتہ سے ۱۸۵۸ء میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ میلسن نے جان ولیم کی کتاب پر نظر ثانی کی اور پھر اس میں ۵ جلدوں کا اضافہ کیا اور ۸ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب *A History of the Indian Mutiny* کے عنوان سے ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔

۴۔ ایک آئرستانی مؤرخ جو ہندوستان میں حکومت برطانیہ کے ایک فوجی افسر کے طور پر برسر کار رہے۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی شورش کو پسپا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کی اصل شہرت کا انحصار ۱۸۵۷ء سے متعلق کتاب پر نہیں بلکہ شیکسپیئر کے ڈرامہ جولیس سیزر پر ان کی وقیع کتاب *Ceaser's Conquest of Gaul: A Historical Narrative* پر ہے۔

۵۔ برطانوی فوج کے مایہ ناز افسر تھے اور انھوں نے لکھنؤ کی فتح میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا اور ان کی کتاب *Lieut. General Sir James Outram's Campaigns in India 1857-1858* اسمتھ ایلڈ اینڈ کمپنی نے لندن سے ۱۸۶۳ء میں شائع کی۔

۶۔ کارل مارکس [Karl Marx]، فریڈرک اینگلز [Friedrich Engels]، *The First Indian War of Independence 1857-59* (ماسکو: پروگریس پبلشرز، ۱۹۵۹ء)۔

۷۔ ایضاً، ۲۹۔

۸۔ دائیں بازو کے مفکر اور ادیب تھے جنھوں نے جارحانہ ہندو قوم پرستی کو فروغ دیا۔ انھوں نے مراٹھی اور انگریزی میں ۳۸ کتابیں لکھیں تاہم ان کی دو کتابیں *The Indian War of Independence* اور *Essentials of Hindutva* بہت مشہور ہوئیں۔

۹۔ ہندوستان کے مایہ ناز مؤرخ ہیں اور قدیم ہندوستان کی تاریخ پر ان کے مطالعہ کو علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور ہندوستان کی تاریخ سیریز سے متعلق ان کی متعدد کتابیں اور تاریخ بنگال ان کی اہم تصانیف ہیں۔

۱۰۔ مشہور مورخ ہیں۔ ان کی کتاب *Eighteen Fifty Seven* پبلی کیشنز ڈویژن محکمہ اطلاعات و نشریات دہلی سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ اس پر ایک طویل اور خیال انگیز مقدمہ مرکزی وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریر کیا۔ سین نے ۱۸۵۷ء سے متعلق اہم دستاویزات، خطوط، اخبارات اور دیگر تحریروں سے استنباط کیا اور ایک جامع اور مستند متن تشکیل دیا۔ ان کی کتاب کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہے اور ۱۸۵۷ء کا کوئی بھی مطالعہ اس کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا ہے۔

۱۱۔ اٹلی کے مشہور مارکسی مفکر انتونیو فرانسیسکو گرامشی[Antonio Gramsci۔۱۸۹۱ء-۱۹۳۷ء]نے Subaltern Studies کی اصطلاح استعمال کی۔ اس کا اطلاق سماج کے اس محکوم طبقے پر ہوتا ہے جو سیاسی اور اقتصادی طاقت سے یکسر محروم ہے اور اس کا بنیادی عمل حکمراں طبقہ کی اجارہ داری کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ آٹھویں دہائی میں ہندوستانی مؤرخ رنجیت گوہا(۱۹۲۳ء-۲۰۲۳ء)نے Subaltern Studies Group کی تشکیل کی جس میں ممتاز عالم اور مؤرخ دیپش مکھرجی، پارتھا چٹرجی، گائیتری چکرورتی اسپیواک، شاہد امین، اور درانکیشو مکھرجی شامل ہوئے۔ ان عالموں نے Subaltern Studies کی سیریز شروع کی اور ان کا مقصد تاریخ نویسی کو حکمراں طبقہ کی عمل داری سے پاک کر کے اسے History From below کے تابع کرنا ہے۔

۱۲۔ اسکاٹ لینڈ کے مشہور مؤرخ، ادیب اور Art curator ہیں اور ان کی شہرت برطانیہ کے مشہور ترین بیانیہ مؤرخ Narrative Historian کی ہے۔ ان کی علمی تحقیقی اور تخلیقی کاوشوں کا اصل مرکز برصغیر ہے اور ۱۸۵۷ء سے متعلق ان کی معروف کتاب *The Last Mughal*(۲۰۰۶ء)ہے جس میں دہلی اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے حوالے سے غدر کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی دیگر کتابیں *City of Dinns: A Year in Delhi*(۱۹۹۳ء)، *From the Holy Mountain*(۱۹۹۷ء)، *White Mughals*(۲۰۰۲ء)، *The Anarchy: The East India Company, Corporate Violence and the Pilage of an Empire*(۲۰۱۹ء)، اور *The Golden Road: How Ancient India Transformed the World*(۲۰۲۳ء)ہیں۔

۱۳۔ خواجہ احمد فاروقی، مترجم و مرتب، *Mirza Asadullah Khan Ghalib: Dastanbuy (A diary of Indian Revolt of 1857)* (نئی دہلی: ایشیا پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۰ء)، ۵۔

۱۴۔ مسودہ روزنامچہ منشی جیون لال؛ بحوالہ خواجہ احمد فاروقی: ذوق جستجو (لکھنؤ: ۱۹۶۷ء)، ۳۶۔

۱۵۔ عبدالطیف، روزنامچہ (دہلی: ۱۹۵۸ء)، ۹۳؛ بحوالہ خواجہ احمد فاروقی، مترجم و مرتب، *Mirza Asadullah Khan Ghalib: Dastanbuy (A diary of Indian Revolt of 1857)* (نئی دہلی: ایشیا پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۰ء)، ۱۱۔

۱۶۔ غالب، دستنبو، مترجم: خواجہ احمد فاروقی، (نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، ۲۰۰۰ء)، ۸۵۔

۱۷۔ ایضاً، ۱۱-۱۲۔

۱۸۔ ایضاً، ۱۶، ۱۷، ۱۸۔

۱۹۔ ایضاً، ۲۰-۲۱۔

۲۰۔ غالب، دستنبو، مترجم: خواجہ احمد فاروقی، ۲۳-۲۴۔

> خدا خدا کر کے وہ منحوس دن ختم ہوا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان سیاہ باطنوں اور بے رحم قاتلوں نے شہر میں جا بہ جا پڑاؤ ڈالا۔ اندرون قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمن سلطانی کو خواب گاہ، رفتہ رفتہ دور دور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہر چھاؤنی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے۔ اور نمک حراموں نے کھلم کھلا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے گروہ کے گروہ خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار، سب یک دل ہو گئے اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر دور و نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لیے کمربستہ ہو گئے۔

غالب، دستنبو، مترجم: خواجہ احمد فاروقی، ۲۵۔

> شہر حاکموں سے خالی اور بندہ ہائے بے خداوند سے بھرا ہوا۔ جیسے باغ، باغبان سے خالی اور درختان بے ثمر سے پر ہو۔ لٹیرے ہر قسم کی پابندیوں سے اور سوداگر محصول ادا کرنے کی ذمہ داریوں سے آزاد۔ گھر ویرانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات (لوٹ مار کرنے والوں کے لیے) "خوان مفت" کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گم نامی کے گوشے میں چھپے ہوئے تھے، وہ گروہ در گروہ خنجر بکف اپنی آرائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔ امن پسند اور نیک نہاد لوگ گھر سے بازار تک آئے ہوئے راستے میں، بیبیوں جگہ عاجزی اور مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر

مجبور ہیں۔ لٹیرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی بستروں پر محو خواب۔

۲۱۔ ایضاً، ۳۳۔

۲۲۔ ایضاً، ۳۷۔

۲۳۔ ایضاً، ۳۹۔

۲۴۔ ایضاً، ۲۲۔

۲۵۔ ایضاً، ۲۲۔

۲۶۔ ایضاً، ۲۳۔

۲۷۔ غالب، دستنبو، مترجم: خواجہ احمد فاروقی، ۳۷۔

> مئی کے مہینے میں اگر انصاف دہلی سے اٹھ گیا تھا تو ستمبر میں ظلم و ستم کا دور ختم ہو گیا اور انصاف کا زمانہ واپس آ گیا۔ چار مہینے چار دن کے بعد سورج آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ دہلی دیوانوں سے خالی ہو گئی۔ عقل مند (انگریزوں) نے بہادری کے ساتھ اس پر قبضہ کر لیا۔

غالب، دستنبو، مترجم: خواجہ احمد فاروقی، ۵۲-۵۳۔

> ان ہندوستانیوں نے اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ بے چاری عورتوں، اور گہوارے میں کھیلتے ہوتے بچوں کو قتل کیا۔ حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے لڑنے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا۔ چوں کہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع اس کا تھا کہ (شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی تک کو زندہ نہ چھوڑتے)۔ لیکن انھوں نے ضبط کیا (اگرچہ ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی)۔ عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔ یہ جو گھر بار اور جان مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز رہے۔ جن لوگوں کو باز پرس کے لیے بلایا گیا ہے، ان کے سوا اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

غالب، دستنبو، مترجم: خواجہ احمد فاروقی، ۶۸-۶۹۔

> ۲۰ فروری کو شام کے وقت ۲۱ دیو آواز، نہنگ آہنگ توپوں کی آواز آئی اور اتوار کی صبح کو شہر لکھنؤ کی فتح کی خوش خبری اس تفصیل کے ساتھ سننے میں آئی کہ ۱۶ فروری کو آسمان سروری کے اختر تابندہ سپہ سالار نام ور کمانڈر انچیف بہادر نے سیاہ رو، جنگ جو (باغیوں) پر اس طرح حملہ کیا کہ آسمان کے سپہ سالار (مریخ) نے سلامت دست و بازو کی اتنی دعائیں دیں اور اس قدر تعریف کی کہ اس کے ہونٹوں پر بتخالے پڑ گئے اور زبان تھک گئی۔ دنیا کو آبادی کا مژدہ اور اہل دنیا کو نوید آزادی! کہ آزاد اور نیک ذات لوگوں (انگریزوں) کی آرزو پوری ہو گئی اور بُرے اور بد ذات لوگوں کا دور دورہ وہاں بھی ختم ہو گیا۔ پھر سننے میں آیا کہ توپوں کی گرج اور شہنائیوں کے نغمے (صرف) حصول طاقت کے شادیانے تھے۔ فتح نصیب فوج کے بہادر اس جنگ کے دوران میں شہر پر قابض نہیں ہوئے (بلکہ) دلیروں کی طرح دشمنوں کو قتل کرنے کے لیے دوڑ پڑے (دشمنوں کو) زخمی اور قتل کرنے کے بعد (اپنے) پڑاؤ کی طرف لوٹ آئے۔

۲۸۔ ان کا شمار عہد حاضر کے ممتاز ناقد اور پس نو آبادیاتی طرز مطالعہ کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ بھابھا کا تعلق بمبئی کے ایک پارسی خاندان سے ہے اور وہ فی الوقت ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی اور امریکی ادبیات میں Anne F. Rothenberg Professor of Humanities کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی اہم کتابیں *Nation and Narrations* (۱۹۹۰ء)، *The Location of Culture* (۱۹۹۴ء)، *Framing Fanon* (۲۰۰۵ء)، *Our Neighbours, Ourselves: Contemporary Reflections On Survival* (۲۰۱۱ء)، اور *Beyond Photography* (۲۰۱۱ء) ہیں۔

۲۹۔ ہومی کے۔ بھابھا [Homi K. Bhabha]، "Of Mimicry and Man: The Ambivalence of Colonial Discourse"، مشمولہ *The Location of Culture* (لندن: رٹلیج، ۱۹۹۴ء)، ۱۲۵۔

اصل متن:

The desire for a reformed, recognisable Other, as a subject of a difference that is almost the same, but not quite?

۳۰۔ غالب، دستنبو، مترجم: خواجہ احمد فاروقی، ۳۸۔

۳۱۔ ایضاً، ۳۸۔

۳۲۔ غالب، دستنبو، مترجم: خواجہ احمد فاروقی، ۴۲۔

سارے شہر میں ۱۵ ستمبر سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دکان دار اور خریدار دونوں غائب ہیں۔ نہ گندم فروش ہے کہ گیہوں خریدیں۔ نہ دھوبی ہے کہ کپڑے دھلنے کو دیں۔ حجام کو کہاں ڈھونڈھیں [ڈھونڈیں] کہ سر کے بال تراشے اور مہتر کو کہاں سے ڈھونڈھ [ڈھونڈ] کر لائیں کہ صفائی کرے۔ بہر حال جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے ان پانچ دنوں میں (گلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے کبھی کبھی آٹا بھی مل جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ صورت حال بالکل ختم ہو گئی۔ گلی کا دروازہ پتھروں سے بند کر لیا گیا اور دلوں کے آئینے پر غم والم کا غبار چھا گیا۔ کوششوں کے سارے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب مصیبتیں خون کو آگ کی طرح جلا رہی ہیں۔

غالب، دستنبو، مترجم: خواجہ احمد فاروقی، ۴۲۔

گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان تھا رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے پیا گیا لیکن آخر کار کوزے یا گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ عورتوں مردوں میں سے کسی میں برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ صبر کے ساتھ دن گزارنے اور (اپنے آپ کو) سامان خورونوش حاصل کرنے کا فریب دینے کا وقت بھی گزر گیا۔ دوشبانہ روز سب بھوکے پیاسے رہے۔ افسوس! یہ گریہ وزاری اور ذلت ومحتاجی! اور صد حیف یہ بے چارگی وپریشان حالی اور بے سروسامانی!۔

۳۳۔ ایضاً، ۵۳-۵۴۔

۳۴۔ ایضاً، ۴۵۔

۳۵۔ ایضاً، ۵۹۔

۳۶۔ ایضاً، ۶۶۔

۳۷۔ ایضاً، ۷۰-۷۱۔

۳۸۔ ایضاً، ۵۴۔

Bibliography

Abdul Latif. *Rōznāmcha (Diary).* Delhi, 1958.

Bhabha, Homi K. "Of Mimicry and Man: The Ambivalence of Colonial Discourse." In *The Location of Culture*. London: Routledge, 1994.

———. *Beyond Photography*. 2011.

———. *Framing Fanon. London*: Routledge, 2005.

———. *Nation and Narration*. London: Routledge, 1990.

———. *Our Neighbours, Ourselves: Contemporary Reflections on Survival*. 2011.

———. *The Location of Culture*. London: Routledge, 1994.

Dalrymple, William. *From the Holy Mountain*, London: HarperCollins, 1997.

———. *The Anarchy: The East India Company, Corporate Violence and the Pillage of an Empire*. London: Bloomsbury Publishing 2019.

———. *The Golden Road: How Ancient India Transformed the World*, London: Bloomsbury Publishing 2023.

———. *The Last Mughal*, London: Bloomsbury Publishing, 2006.

———. *White Mughals*., London: Penguin Books, 2002.

Faruqi, Khwaja Ahmad, trans. and ed. Mirza Asadullah Khan Ghalib: *Dastanbū (A Diary of the Indian Revolt of 1857)*. New Delhi: Asia Publishing House, 1970.

Ghalib, Mirza Asadullah Khan. *Dastanbū*. Trans. Khwaja Ahmad Faruqi. New Delhi: Taraqqi Urdu Bureau, 2000.

Hali, Altaf Husain. *Ḥayāt-i Jāvēd*. Kanpur: Muhammad Rahmatullah Ra'd Nami Press, 1901.

Khan, Sir Syed Ahmad. *Asbāb-i Baghāvat-i Hind (*The Causes of the Indian Revolt). Aligarh, 1858.a

Malleson, G. B. *History of the Indian Mutiny*. 8 vols. London, 1891.

Martin, Robert Montgomery. *Caesar's Conquest of Gaul: A Historical Narrative*, n.d.

Marx, Karl, and Friedrich Engels. The First Indian War of Independence, 1857–59. Moscow: Progress Publishers, 1959.

Munshi Jivan Lal. *Musavvada Rōznāmcha (Manuscript Diary*); cited in Khwaja Ahmad Faruqi, *Zauq-i Justujū.* Lucknow: 1967.

Outram, James. *Lieutenant General Sir James Outram's Campaigns in India, 1857–1858*. London: Smith, Elder & Co., 1863.

Savarkar, Vinayak Damodar. *Essentials of Hindutva.*

———. *The Indian War of Independence.*

Sen, Surendra Nath. *Eighteen Fifty-Seven*. Delhi: Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting, Government of India.